ڈاکٹر سید صادق گوہرین

ایران کا چوتھی صدی ہجری کا علمی ماحول

مختلف علوم وفنون اور اصناف ادب کے وجود میں آنے کے اعتبار سے چوتھی صدی ہجری اسلامی تمدن کا درخشاں ترین دور شمار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ماضی کے علماء وفضلاء نے علوم وفنون کے جو پودے لگائے تھے وہ اس صدی میں تناور درخت میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان کی شاخیں اسلامی مملکتوں کے اکثر وبیشتر علاقوں پر سایہ فگن ہو چکی تھیں۔

علم ومعرفت کے اعتبار سے اس صدی میں، جو یقیناً پوری اسلامی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، لاکھوں عالم، دانشور، فلسفی، حکیم، ادیب اور شاعر وسیع وعریض اسلامی مملکت میں زندگی گذار رہے تھے۔ اس وسیع اسلامی مملکت کے ہر گوشے میں جو اسپین سے دیوار چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے علما اور دانشور موجود تھے جنہیں اپنے عہد کے مختلف علوم وفنون پر نہ صرف عبور حاصل تھا بلکہ وہ اپنے عہد کے بزرگان علم میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس صدی کے بعد ان مملکتوں میں ایسے بے نظیر علماء ودانشور پیدا نہیں ہوئے۔ خراسان اور ماوراء النہر بھی اس عظیم دولت سے محروم نہیں تھے بلکہ ان کے ہر گوشہ وکنار میں ''ابو الخیر خمار'' ابو ریحان بیرونی'' اور ''ابو علی سینا'' جیسے بڑے حکما موجود تھے اور یقیناً ان کا اسلامی علوم وثقافت کی تاریخ میں کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

بیشتر معلومات کے لئے نامناسب نہ ہوگا کہ اس صدی کے علمی ماحول کا گذشتہ

صدیوں سے ایک سرسری موازنہ کرلیا جائے تا کہ اس صدی میں علمی مکاتب اور ابوعلی سینا اور ان جیسے دوسرے علماء وفضلا کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل بہتر طور پر سمجھے جاسکیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی عالم یا دانشور اچانک یا آناً فاناً وجود میں نہیں آجاتا بلکہ اس کا وجود میں آنا ان اسباب اور حالات پر منحصر ہوتا ہے جن پر غوروفکر کئے بغیر اس کی دانشوری ، اور درایت اور علم کی سطح میزان معلوم نہیں ہوسکی۔ لہٰذا ہم ابوعلی سینا کے عہد کے متداول علوم کی کیفیت اور ان علوم سے ان کے فائدہ اٹھانے کے طریقۂ کار کے بارے میں بیشتر معلومات کے لئے ان سے پہلے کے ادوار کی جانب مختصر اشارہ کرتے ہیں۔ البتہ اس نکتے پر توجہ دینا چاہیے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں علوم عقلی ونقلی کی کیفیت اور گزشتہ صدیوں سے چوتھی صدی تک کے مشہور علمی مکاتیب کی تفصیل بیان کرنے کا مقصد ان علوم ومکاتیب کی جزئیات میں جانا نہیں ہے بلکہ نہایت اختصار سے ان اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو ابوعلی سینا کے عہد کے ثقافتی حالات کی شناخت میں ہمارے معاون ہوں گا۔

جزیرۃ العرب کے باشندے جن کے درمیان اسلام کا ظہور ہوا اور جن کے وسیلے سے وہ اطراف کے ملکوں میں سرایت کرتا گیا نیز نہایت کم عرصے میں جنہوں نے سیاسی اعتبار سے وسیع اسلامی شہنشاہیت تشکیل دی، ایسے لوگ تھے جو علم ومعرفت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ دور جاہلیت کے عرب بقول جاحظ: تمدن ومدنیت سے بہت دور تھے۔ نہ تو وہ تجارت کرتے تھے اور نہ ان کے پاس کوئی صنعت تھی اور نہ ہی کھیتی باڑی۔ ان کے پاس نہ تو کوئی حکیم تھا اور نہ ہی حساب کتاب انہیں آتا تھا۔ اور جو کچھ انہوں نے بعد میں تمدن اور مدنیت کے ذریعے حاصل کیا وہ ساسانیوں، قیصر روم اور ان دیگر قوم وملل کا حاصل کردہ تھا جنہوں نے ان پر حکومت کی تھی۔ اور بقول محمد جریر طبری:

"عرب کے یہ زندہ لوگ یا ملت زندۂ عرب دراصل ایسے لوگ تھے جنکو خدا کی ذلیل ترین مخلوق شمار کیا جاتا تھا اور جو نہایت پستی میں زندگی بسر کررہے تھے۔ گمراہ اور تاریک ترین

راہوں میں ننگے بھوکے بھٹک رہے تھے اور ہمیشہ دو بڑی اور متمدن حکومتوں، روم وایران کے دباؤ میں جی رہے تھے اور ان ہی کی سرپرستی میں زندگی گذار رہے تھے۔ اور چونکہ ان کے اپنے وطن میں کوئی ایسی قابل ذکر چیز نہیں پائی جاتی ہے اس لئے ان دونوں مملکتوں کے حملوں سے بھی محفوظ تھے۔ وہ بڑی بری حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ٹوٹ اور بکھر رہے تھے انہیں کھانے پینے تک کی کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خداوند عزوجل نے ان پر رحمت نازل کی اور اسلام کا وہاں ظہور ہوا۔ کتاب وسنت سے آگاہ ہوئے اور اس طرح اسلام کے پرتو میں جہاد ان پر فرض ہوا۔ وہ اطراف کے ممالک کی طرف بڑھے اور خدائی امداد اور قرآن سے روشنی حاصل کرکے دنیا کے ملکوں کو فتح کیا اور پورے عالم پر حکمرانی کی۔"[1]

دور جاہلیت کے عربوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت کی طرف جاحظ اور طبری نے اشارہ کیا ہے۔ عقلی لحاظ سے بھی یہ لوگ نہایت وحشی پن اور بربریت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا علم، خرافات، کہاوتوں افسانوں، حکایتوں، قصوں اور انساب کی حد تک محدود تھا۔ وہ طب و فلسفہ اور دیگر علوم سے بالکل بے بہرہ تھے اور ان کے "دانشمندوں" نے خرافات، جہالت، منافرت اور احمقانہ فخر ومباہات میں اپنی زندگیاں گذار دی تھیں، مجموعی طور پر اس جلتی سرزمین کے باشندے خرافات، نادانی وبے خبری کے دلدل میں ہاتھ پیر مار رہے تھے جس کی تفصیل اس قوم کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ دین مبین اسلام کا ظہور ہوا اور تاریخی روایت کے مطابق جس کی علت بھی اس قوم کی اقتصادی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے، اس خدائی دین کے احکام کے ذریعے انہوں نے مختلف اقوام وملل اور ممالک پر تسلط حاصل کیا۔

جوں ہی عربوں نے عربستان سے باہر قدم رکھا ان کی عقلی حالت دگرگوں ہوگئی کیوں کہ انہوں نے بہت جلد کرۂ زمین کا ایک حصہ جو تقریباً چین اور موجودہ فرانس تک پھیلا ہوا تھا، حاصل کرلیا، اس وسیع علاقے کے لوگوں سے ان کے تعلقات استوار ہوئے جو ثقافتی لحاظ سے عربوں سے بھی ہزاروں سال آگے تھے۔ انہوں نے ان کے عقلی اور نقلی آثار سے فائدہ اٹھایا

خاص کر اس لئے بھی کہ عربوں نے اس زمانے کے متمدن ترین علاقے روم وایران پر تسلط حاصل کرلیا اور مذکورہ دونوں عظیم ملکوں کی تہذیب وثقافت کے عظیم ذخائر سے سیراب ہوئے۔

عربوں نے اسلامی ملکوں کے متمدن باشندوں کے ساتھ رہ کر نہ صرف خود کو غنی کیا بلکہ وہ اپنے زیر نگین تمام ممالک اور مختلف اقوام وملل کو پرچم اسلام کے زیر سایہ کرکے ایک عظیم اور حیرت انگیز تمدن وثقافت وجود میں لانے میں کامیاب ہوئے جسے ہم آج اسلامی تمدن وثقافت کہتے ہیں۔ یہ تمدن وثقافت جو اپنی حد تک یقیناً روم وایران ومصر کی ثقافت سے عظیم تھی، صدیوں باقی رہی اور اس نے دنیائے علم وادب کو علماء ودانشور دیئے جن کے زیر سایہ تمدن کا قافلہ دور دراز اور طولانی راستہ طے کرسکا اور دنیا کے ایک حصہ کو قرون وسطی کی بربریت اور وحشی پن سے نجات حاصل ہوگئی۔

ممالک اسلامیہ کی مختلف النوع اقوام طرز زندگی، اقتصاد، سیاست، معاشرتی تشکل، مملکت ومذہب کی صورتحال کے اعتبار سے اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اسلام کی پہلی صدی میں، چونکہ ابھی ان مختلف اقوام وملل کا اختلاط وامتزاج فتوحات اسلامی کی وجہ سے شروع نہیں ہوا تھا، ہر ایک قوم اپنے قدیمی تمدن پر فخر کرتی تھی اور اپنے ماضی کی ثقافت کو گلے سے لگائے ہوئی تھی۔ لیکن خلافت بنی عباس کے آغاز میں ہی وہ تمام اختلاف وامتیازات ختم ہوگئے اور وہ تمام ممالک ومختلف اقوام ایک حکومت کے تحت آگئے جو حکومت اسلامی ممالک کے نام سے جانی جاتی تھی اس اتحاد کا سبب وسیع وعریض اسلامی ممالک کے باشندوں کا ایک دوسرے کے درمیان آپسی میل جول تھا۔ وہ چاہے اقتصادی لحاظ سے ہو یا سیاسی اعتبار سے یہ اختلاط اجباری تھا اور ان وسیع ممالک کے باشندے خواہ مخواہ ایک دوسرے سے بیشتر تعلقات بڑھانے پر مجبور تھے۔ عباسیوں کے عہد تک عرب اور غیر عرب کے درمیان شادی بیاہ تقریباً ممنوع تھا اور اگرچہ کوئی قانونی پابندی نہیں تھی تاہم اس قسم کی شادیاں عربوں کے لیے چندان خوش آئندہ نہیں تھیں۔ جبکہ اسلام نسلی برتری کا قائل نہیں ہے۔ اور انسان پر انسان

کی برتری کا انحصار تقویٰ اور پرہیزگاری کو جانتا ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر بنی امیہ غیر عرب سے راہ ورسم نہیں رکھتے تھے۔ غیر عرب کی لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے تھے اور جن کے ماں باپ غیر عرب تھے انہیں حقیر سمجھتے تھے اور ان کو ''ہجین'' کہتے تھے۔ عربوں میں اس زمانے میں اس لفظ کا اطلاق ان پر ہوتا تھا جن کی مائیں غیر عرب تھیں۔ یہ لفظ تقریباً ایک طرح کے دشنام کا مترادف تھا۔ اموی نے بھی اس بات کی کوشش کی کہ مختلف علاقوں کے حکمرانوں کے انتخاب میں ایسے لوگ شامل نہ ہوں۔

انہوں نے اس کی بھی کوشش کی کہ موالی یعنی غیر عرب، کبھی بھی عرب عورتوں سے شادی نہ کرسکیں چنانچہ ایک موالی نے قبیلہ ٔ بنی سلیم میں شادی کی اور جب محمد بن بشر خارجی نے معاملے کو سمجھ لیا تو اس نے اس وقت کے حاکم مدینہ ابراہیم بن ہشام بن اسمٰعیل سے شکایت کی۔ حاکم نے حکم دیا کہ وہ موالی لایا جائے۔ اس کی بیوی کو اس سے الگ کردیا گیا اور اسے سوتازیانے لگائے گئے نیز اس کی داڑھی اور سر کے بال مونڈ دیے گئے۔ ۱۷

اس قسم کی روایات جو عربوں کے غیر عرب کے ساتھ امتیاز کی مظہر ہیں۔ قدیم کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن اس نکتے کی جانب بھی اشارہ ضروری ہے کہ خاندان بنی ہاشم ایسی خرافات سے الگ تھلگ تھا۔ وہ تمام مسلمانوں کو بھائی سمجھتا تھا اور ان سے راہ ورسم رکھتا تھا۔ علی ابن ابی طالب نے کبھی بھی کسی کو کسی پر برتر نہیں سمجھا اور عرب وعجم کو بھی ایک دوسرے پر ممتاز نہیں کیا۔ وہ عرب قبائل کے امراء روسا کو موقع ومحل کے لحاظ سے قابل احترام سمجھتے تھے اور عربوں کی ان سے روگردانی کی یہ خود ایک بڑی وجہ تھی۔ ۱۸ امام حسین علیہ السلام نے غیر عرب میں شادی کی اور اس خاتون سے آپ کے یہاں ایک فرزند متولد ہوا جس کا نام ''زین العابدینؑ'' رکھا گیا جو شیعوں کے چوتھے امام ہیں۔ لیکن خاندان بنی امیہ اور دیگر عرب قبائل (اس معاملے میں) سخت تعصب سے کام لیتے تھے اور برسہابرس انہوں نے نہ تو غیر عرب سے کوئی اختلاط وآمیزش کا سلسلہ رکھا اور نہ ہی غیر عرب سے شادی بیاہ کیا۔

چونکہ عرب وعجم کا یہ عدم اختلاط فطری نہیں تھا اسلئے دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ ۴ اور پہلی صدی کے اواخر نیز دوسری صدی کے اوائل سے عرب وغیر عرب کے درمیان اختلاط وآمیزش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ ولید بن عبد الملک شاہ اسپرم نے فیروز ابن یزدگرد شہر یار کی بیٹی سے شادی کی۔ اس سے اسے دو بیٹے ہوئے اور دونوں ہی یزید وابراہیم کے نام سے خلیفہ ہوئے۔ ۵ مروان بن محمد کی والدہ کردستان کی رہنے والی تھی۔ ۶

اس امتزاج وآمیزش میں عباسی دربار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیوں کہ انہیں اپنے لہو ولعب کی محفلوں کے لئے کنیزوں کی سخت ضرورت تھی اور یہ کنیزیں خلفا اور بزرگان عباسی کی ہمسری کے رتبہ تک پہونچ جاتیں چنانچہ اکثر عباسی خلفا اور شہزادوں کی مائیں غیر عرب تھیں۔ ہارون رشید کے پاس گانے بجانے اور ساقی کا کام کرنے والی ہزاروں کنیزیں تھیں جو مختلف اقوام سے تعلق رکھتی تھیں اور دربار خلافت میں جمع ہوئی تھیں۔ ۷

ان کنیزوں نے عرب وعجم کے میل جول میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس زمانہ کے خلفا اور شہزادوں اور امرا نے کنیزوں کے سلسلے میں خاص دلچسپی دکھائی اور اکثر عباسی خلفاء شہزادے اور اس خاندان کے امرا اسی اختلاط کا نتیجہ تھے۔

ابو جعفر منصور خلیفۂ دوم عباسی کی ماں سلامۂ بربری تھی۔ مامون کی ماں، مراجل، اور معتصم وواثق ومتوکل کی والدہ غیر عرب کنیزیں تھیں۔ خلیفۂ عباسی مہدی کے بیٹوں کی ماں کا نام 'خیزران' تھا جو خرشنہ کی رہنے والی تھی۔ خرشنہ، ملطیہ کے قریب واقع ایک شہر تھا۔ ۹

عرب وعجم کا اختلاط دوسری صدی ہجری سے شروع ہوا اور کچھ ایسا رائج ہوا کہ عربستان کے ان شہروں میں بھی جہاں قدیم روایات کے مطابق غیر عرب سے معاشرت سے پرہیز کیا جاتا تھا، فقہا اور دانشوروں کے فتووں کی بدولت غیر عرب سے معاشرت کی جانب رغبت پیدا ہوئی۔ صاحب عقد الفرید نے اصمعی سے روایت کی ہے کہ اکثر اہل مدینہ غیر عرب عورتوں سے اختلاط سے پرہیز کرتے تھے اور ان سے معاشرت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

یہاں تک کہ علی بن حسین (ع) قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ نے جو اس وقت کے معروف فقہا میں تھے، اس کا فتوا صادر کیا اور خود انہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی اور دیگر اہالیان شہر نے بھی ان کی پیروی کی اور غیر عرب کنیزوں سے اختلاط پیدا کیا۔ [۱۵]

یہ اختلاط اور میل جول اس قدر بڑھ گیا کہ بہت کم عرصے میں پورے اسلامی ممالک میں ایسا کوئی گروہ یا طبقہ دیکھنے میں نہیں آتا جن کے والدین ایک نسل سے ہوں۔ اس اختلاط وآمیزش سے ایک نئی نسل وجود میں آئی جو نہ عرب تھی اور نہ اس زمانے کی اصطلاح میں عجم تھی اور اس نسل نے جو عربوں کا دیگر اقوام عالم سے اختلاط کا نتیجہ تھی، ایک امت واحدہ کی تشکیل کی جسے ملت اسلامیہ کہنا چاہئے۔ اس نے ایک ایسے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے سیاسی، اقتصادی اورسماجی تاریخ میں، اسلامی تمدن کہا جاتا ہے۔

گوناگوں اسلامی اقوام نے جس طرح اختلاط وآمیزش سے ایک امت کی تشکیل کی اسی طرح بچگانہ ونسل پرستانہ تصورات سے بھی رہائی حاصل کی۔ عقل وفکر کے اعتبار سے بھی ان میں اچانک اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں اور مختلف اقوام کے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے بعد ان میں ایسے نئے افکار ومعانی وجود میں آئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ یونانی، رومی، ایرانی، مصری، مراکشی، اسپینی اور عرب وغیرہ مختلف مذاہب مثلاً عیسائی، یہودی، زرتشتی اور اسلام کے ماننے والے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے قریب ہوئے اور معاشرت ومخالطت کے نتیجے میں ایک دوسرے کے آراء وعقائد کے بارے میں مفید معلومات حاصل کیں اور ان ملل ومذاہب سے تبادلۂ خیالات نے فطری طور پر ایک نئے عقیدے کی نشوونما کی جس کی مثال نہیں۔ اس بنا پر دنیا میں ان کے یادگار اثرات باقی رہ گئے جو کاروانِ تمدن بشر کے نقطہ نگاہ سے بہت عظیم، گراں قدر اور قابل غور ہے اور اس قابل ہے کہ بلند پایہ علما، ودانشور اپنے عہد کو اس راستے پر ڈال دیں اور اس کے عظیم ثمرات سے اپنے عہد کی نسل کو آگاہ کریں۔

مختصر یہ کہ اسلام نے جس طرح مختلف ممالک کی اقوام کو جنہیں اپنی سرپرستی میں لیا

تھا، یکسر بدل کر رکھ دیا اسی طرح ان کے افکار ونظریات اور جذبات واحساسات پر بھی زبردست اثرات مرتب کئے۔ ساتھ ہی ان کے طرز فکر کی سمت بھی بدل ڈالی۔

ظاہر ہے ان تمام تغیر وتبدل سے جس قوم کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا وہ عرب قوم تھی جو عہد جاہلیت میں علم ومعرفت سے یکسر بے بہرہ تھی اور تمدن کے اعتبار سے پست ترین زندگی بسر کررہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ علمائے مصر وایران، روم واندلس اور دیگر ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے نہ صرف علوم اسلامی کی بنا ڈالی بلکہ انہیں اپنے علم ودانش کے ذریعے اتنا مستحکم بنادیا کہ وہ روئے زمین کے عظیم میدان میں صدیوں لوگوں پر حکومت کرسکے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں علوم کی راہ:

یہاں مذکورہ عنوان کے تحت بحث کا یہ مطلب نہیں کہ ماضی کی تمام صدیوں کے علمی حالات کا مکمل جائزہ پیش کیا جائے بلکہ مقصد علوم اسلامی کی تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ہے جو بوعلی سینا او ان جیسے دیگر علما کے وجود میں آنے کا سبب بنی ہے۔ لہٰذا اس موضوع سے راقم سطور کا مقصد عہد اسلامی کے علمی امور کی جذئیات بیان کرنا نہیں ہے۔ اسی حد تک اکتفا کیا جائے گا جس سے ہم اپنے موضوع سے قریب تر رہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جاہل عرب کسی قسم کے قابل ذکر تمدن کے حامل نہیں تھے۔ اسلام نے اپنے ظہور کے آغاز میں صرف روشن خیالی کے سوا عرب ثقافت میں کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا تھا اور اسی بنا پر مفتوحہ ممالک میں ظہور اسلام کے اوائل میں علم ومعرفت کے لحاظ سے کوئی نئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔ کیونکہ مسلسل جنگوں کی وجہ سے ترقی کے کاموں کے مواقع نہیں ملتے تھے اور دوسری بات یہ کہ مفتوحہ ممالک اور شہروں کے لوگوں میں میل جول نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی ثقافت کے نام سے کوئی نئی ثقافت ابھی وجود میں نہیں آپائی تھی۔ پہلی صدی ہجری جنگ وجدال، ملکوں کو فتح کرنے اور خلافت کے موضوع پر مسلمانوں میں اندرونی

کشاکش اور اس جیسی دیگر چیزوں کی نذر ہوگئی تھی۔ اور علم ومعرفت کے ظہور کا کوئی مقام باقی نہیں رہ گیا تھا۔

مسلمان جس شہر میں بھی داخل ہوتے تھے لوگوں کی نئے دین کی جانب دعوت دیتے تھے اور پیغمبرؐ کے اصحاب، جو فاتح لشکر کے ساتھ شہروں میں داخل ہوتے تھے، تو لوگوں کو اسلام کے احکام، اصول فروع اور مناسک وغیرہ سے آگاہ کرتے تھے۔ غالباً خود بھی یہ اصحاب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور ان لوگوں نے اپنی پوری عمر میں کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی۔ لیکن رسول اکرمؐ کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے قرآن کریم یاد کرلیا تھا اور اصول فروع واحکام دین سے بھی بخوبی واقف تھے اور مختلف ممالک کے لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔ عرب کی مغلوب اقوام بھی چونکہ نئے دین سے بے خبر تھیں اس لئے جو کچھ انہیں بتایا جاتا اسے ہی کافی سمجھتی تھیں۔ کیوں کہ جن عوامل کا ذکر کیا گیا ان کے پیش نظر انہیں نئے دین کے بارے میں غور وفکر کی فرصت نہیں تھی۔ خلفائے راشدین بھی، جو پیغمبرؐ کے سچے ساتھی تھے اور دوران جاہلیت میں ایک عمر بسر کر چکے تھے، اطراف کے متمدن ممالک مثلاً روم وایران ومصر کے گراں بہا علوم وفنون سے واقف نہیں تھے۔ اسی لئے جب عمر بن عاص نے اسکندریہ کو فتح کیا تو خلیفۂ دوم حضرت عمر سے پوچھا کہ کتابخانۂ اسکندریہ کا کیا کیا جائے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے صرف کتاب خدا کافی ہے۔ یعنی قرآن کریم ہمیں دنیا کی تمام کتابوں سے مستغنی کردیتا ہے۔[۱۱]

بنی امیہ کو بھی اس خاندان کے ابتدائی خلفاء کی اپنے مخالفین کے ساتھ کشمکشوں، ان کی احمقانہ نسل پرستی اور تعصب اور ان میں سے اکثر کا لہو ولعب میں بسر کرنے کی وجہ سے مفتوحہ اسلامی ممالک کے علم وادب اور تمدن وثقافت کے عظیم اور بیش قیمت خزانے سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ ان ملکوں کے عوام بھی مذکورہ جابر خاندان کی حکومت کے اہل کاروں سے مقابلے میں ہمہ تن مصروف تھے لہٰذا اس خاندان کے عہد اقتدار میں علم ومعرفت میں

چنداں ترقی نہیں ہوئی اور کسی کو علوم وفنون کے بارے میں غور وفکر کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ان تمام باتوں کے باوجود خلفائے بنی امیہ نے اطبا کی اشد ضرورت کے پیش نظر مدرسہ اسکندریہ، جندی شاپور کالج اور دیگر بلند پایہ طبیبوں سے فائدے اٹھائے۔ ابن اصیبعہ نے کئی بڑے ایرانی اور مصری حکیموں کے نام گنوائے ہیں جن سے اموی خلفا نے فائدہ اٹھایا تھا اور اس عہد میں رائج نسلی فخر ومباہات کی وجہ سے شاعری اور خطابت نے بہت ترقی کی۔ نتیجے میں عظیم شعرا اور فصیح وبلیغ خطباء پیدا ہوئے جن کا کام عرب یا عجم قوم پر فخر ومباہات کرنا، یا ایک دوسرے کو برتر بتانا تھا اور چونکہ خلفا کو محرروں کی ضرورت تھی اس لئے اس دور میں بلند پایہ منشی اور قلم کار پیدا ہوئے جن کا تفصیلی ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ان تمام حالات کے باوجود اس دور میں علوم اسلامی کے ظہور میں آنے کی بنیاد ڈال دی گئیں۔ عصر اسلامی میں جس پہلے شخص نے تاریخ کی طرف توجہ دی وہ معاویہ ابن ابوسفیان تھا جس نے عبید بن شریہ الجرہمی کو موقع دیا اور اس سے پہلے عرب کے حالات پوچھے اور اس نے جوابات دیے۔ معاویہ نے حکم دیا کہ ان تمام روایات کو جمع کیا جائے لہذا دو کتابیں جمع ہوگئیں۔ ایک کتاب الامثال جس میں پچاس ورق تھے اور دوسری کتاب اخبار الماضیین ۱۲ جو کئی جزوں پر مشتمل تھی۔ زیور وجود سے آراستہ ہوئیں اگر یہ روایت صحیح ہے تو معاویہ کا یہ عمل بظاہر پہلا علمی کام ہے جو تاریخ اسلام میں انجام پایا۔

اموی خلفا کے حالات کے مطالعے کے دوران یزید بن معاویہ کے بیٹے خالد پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے جو طب اور کیمیا کے بارے میں معلومات رکھتا تھا اور جس نے دونوں فن ایک راہب سے سیکھے تھے۔ اس شخص کو مذکورہ علوم کے بارے میں معلومات رکھنے کی وجہ سے ''حکیم آل مروان'' کہا گیا ہے۔ ۱۳ مجموعی طور پر وہ عالم، فاضل اور علم دوست شخص تھا اور علماء وفضلا کا احترام کرتا تھا۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے یونان کے کچھ فلسفیوں کو، جو مصر میں زندگی بسر کر رہے تھے، اپنے پاس بلایا اور انہیں مصری اور یونانی صنعتی اور علمی کتابوں کا

عربی زبان میں ترجمہ اور نقل نویسی کا کام سونپا تھا۔ اگر یہ بات درست ہے تو یقیناً غیر عربی سے عربی زبان میں ہونے والا یہ پہلا ترجمہ ہے جو انہوں نے کیا اور یہی ترجمے بعد کے برسوں میں اور عباسیوں نیز مامون کے زمانے میں ہونے والے تراجم کی بنیاد رہے ہوں گے۔ امویوں کے زمانے میں محاسبات اور سرکاری دیوانوں کے عربی میں ترجمے ہوئے جو اس وقت تک پہلوی اور رومی میں لکھے جاتے تھے جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مجموعی طور پر خاندان بنی امیہ کی حکومت میں ان اسباب وعلل کی وجہ سے جن کا ذکر کیا گیا اور اسلامی ممالک واقوام کے مابین ایک دوسرے سے میل جول نہ ہونے کی وجہ سے کوئی علمی کام صحیح طور پر انجام نہ پاسکا اور اگر طب یا معدودے چند کتابوں کا ترجمہ ہوا بھی ہے تو وہ صرف مجبوری کی بنا پر ہوا ہے۔ کیونکہ خلفاء کو طبیب اور اپنے حسابوں کی جانچ پڑتال کے لئے بعض فنون مثلاً کیمیا کی ضرورت تھی۔ ورنہ اس عہد میں کسی مدون یا عالمانہ تحقیقی کتاب یا مفید ترجمے کا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا عہد اموی بھی اسلامی ثقافت کے اعتبار سے خلفائے راشدین کے عہد جیسا ہی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ امویوں کے احمقانہ تفاخر اور بچگانہ نسلی تعصبات شاید شعوبیہ فرقے کے وجود میں آنے کا سبب بنے۔

حق تو یہ ہے کہ اموی حکومت میں علما کی قدر ومنزلت تھی اور عالم کو شریف اور محترم سمجھا جاتا تھا اور نسلی تفاخر اور عربی تعصب ان کے مقام ومرتبے کو کم نہیں کرتا تھا۔ عالم خواہ عرب کا ہو یا عجم کا، قابل احترام تھا۔ بنو امیہ غیر عرب دانشوروں مثلاً حسن بصری، محمد بن سیرین اور عطا بن یسار کا اسی طرح احترام کرتے تھے جس طرح وہ عرب دانشوروں مسروق بن اجدع، شریح اور قتادہ کا احترام کرتے تھے، شروع کے تمام دانشور جو سب کے سب غیر عرب تھے، درس وتدریس کی مجلس برپا کرتے تھے جن میں عرب اور غیر عرب بلا کسی امتیاز کے شرکت کرتے تھے اور استادوں کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے حتی کہ حسن بصری اپنے درس کے جلسوں میں خلفائے بنی امیہ اور نامی گرامی سردار یزید بن مہلب پر سخت تنقیدیں کرتے

تھے اور کھل کر کہتے تھے کہ ”یزید اور بنی امیہ دیو صفت گمراہ ہیں جن سے پرہیز کرنا چاہئے۔“ اس کے باوجود جب حسن بصری کا انتقال ہوگیا تو ان کے جلوس جنازہ میں شہر کے تمام لوگوں نے شرکت کی۔ مجمع اتنا تھا کہ اس زمانے میں مسجد میں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں تھی اور لاکھوں مرد عورتیں صرف انکے جلوس جنازہ میں شرکت کے لئے آئے تھے۔۱۵

اموی حکومت کے اواسط میں مفتوحہ ممالک کی اقوام کی اسلامی اصولوں کی تشریح وتوضیح نیز عربی زبان سے آشنا ہونے کی ضرورت کے پیش نظر جو سیاسی اور دینی زبان تھی، کچھ فقیہ یا دانشور اور نحوی وصرفی اور مفسر وغیرہ پیدا ہوئے۔۱۶ ان دانشوروں اور نحویوں نے بھی جو کچھ سیکھا تھا اس کی تعلیم دینے کے لئے ، حلقات درس“ کے نام سے مدارس کھول رکھے تھے۔جن کی تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔

عہد عباسی کے علوم:

ایران وروم ومصر ومراکش واندلس اور اسلامی سلطنت کی مختلف اقوام ، اقتصادی اتحاد کے وجود میں آنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے اختلاط وآمیزش پر مجبور تھیں اور خواہ ان عظیم ممالک پر عرب قوم کے تسلط اور اسلام کے احکامات پر عمل درآمد سے یہ آمیزش واختلاط بہت ضروری ہوگیا اور اسی سبب سے ابھی اسلام کی پہلی صدی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان اقوام نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی غرض سے اپنے علمی آثار سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا جس کے نتیجہ میں اقوام ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اسکے لئے ایک زبان لازم تھی جس میں وہ اپنے علمی آثار اور کتب کا ترجمہ کریں۔ جو تمام اقوام کے درمیان مشترک ہو، اس مسئلے کو عربی زبان نے حل کردیا جو مسلمان فوجیوں کے ساتھ دنیا کے تمام علاقوں میں پہونچ چکی تھی اور عظیم اور متمدن اقوام جنہوں نے وسیع اسلامی سلطنت قائم کی تھی اس زبان سے اپنے علمی اور ادبی مفاہیم کو سمجھنے کا کام لیا تھا۔

اس زمانے میں ایران وروم کی دو بڑی اقوام نے اپنے زبردست تمدن کی بنا پر دیگر

اقوام سے زیادہ ادب وعلوم اسلامی سے بہت فائدہ اٹھایا کیونکہ یہ دونوں اقوام جنہوں نے قبل از اسلام بہت سی دیگر اقوام حتیٰ عربوں کا استحصال کیا تھا عظیم اور حیرت انگیز تمدن اپنے تمام وسائل کے ساتھ عربوں کے ہاتھ میں آگئیں اور اسلام کے زیر نگیں ہوگئیں لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی تمدن، ایران وروم کے تمدن کا ایک امتزاج ہے تو چنداں غلط نہ ہوگا۔

ایرانی قوم اسلامی تمدن کے تمام مظاہر وشعائر میں موثر واقع ہوئی اور اس مملکت میں اسلام کی آمد کے وقت سے ہی اس ملک کے علماء یا مصنفین اور ادبا نے عربی زبان سیکھی اور ابھی اس سرزمین میں عربوں اور اسلام کو آئے چند سال بھی نہ گذرے تھے کہ ''زیاد اعجم'' نے جو اصلاً اصفہانی تھا اور جس نے ایک عمر خراسان میں گذاری تھی اس زبان میں شعر کہنا شروع کردیا تھا اور ان ہی ابتدائی صدیوں میں بہت سے ایرانیوں مثلاً اسرة بن یسار نسائی اسماعیل بن یسار، محمد بن ابراہیم ۸ اور دیگر ایسے لوگوں کو پاتے ہیں جو عربی زبان میں شاعری کرتے تھے اور چونکہ اکثر شعوبی تھے اس لئے انہوں نے اپنے کلام میں ایرانیوں کو عربوں پر ترجیح دی۔ ان شعراء وادباء ومصنفین نے عربی شاعری، کتابت اور تصنیف وتالیف کا باب کھولا اور عہد جاہلیت کی شاعری کو جو صحرا وشتر ومعشوق کی تعریف سے آگے نہیں بڑھی تھی، اضمحلال، محویت اور نیستی سے نجات دی۔ خلافت اموی کے زبردست مصنفین اور منشیوں نے بھی تصنیف وتالیف اور کتابت کا باب کھولا جس سے عرب واقف نہیں تھے اور اسے اس حد تک بلند مقام پر پہنچا دیا جسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

بادیہ نشین عرب جنہیں اپنے تمدن کے پورے دور میں جز شتر، صحرا اور خار مغیلاں کے کسی اور موضوع سے سروکار نہیں تھا اور اپنی زندگی گذارنے کے لئے جنہیں صرف معدودے چند چیزوں کی ضرورت تھی، ممالک کی فتح اور ایران کے عظیم تمدن سے قربت کے بعد ایسے بہت سے حیاتی مظاہر سے آشنا ہوئے اور ان کے نام ایرانی زبان سے حاصل کئے جیسے کوزہ، طشت، خز، دیباج، یاقوت، فیروزہ، بلور، فالوزج، لوزینہ، فلفل، زنجبیل، نرجس، عنبر، کافور،

صندل، قرنفل، ارجون، بستان، جوز، دولاب، ابریق، زنبق، صولجان، کوسج، فرسخ، زنبید وغیرہ جن کے ذکر کے لئے علاحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ بہت سے ماہرین لغت نے اس قسم کے الفاظ کو، دخیل، کا نام دیا ہے اور لغت کی ضخیم کتب مثلاً المعرب تالیف جو الیقی میں شامل کیا ہے۔

ان دوموضوعات یعنی شاعری اور لغت نویسی اور عربوں پر اس کے اثرات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایران کا حیرت انگیز تمدن اسلامی ثقافت کی پیشرفت میں کس حد تک موثر رہا ہے۔ ابتدائی صدیوں کی ادبیات ورویات کی تمام کتابیں ایرانیوں کے علمی، ادبی، فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات سے بھری پڑی ہیں جن سے عربوں نے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔عرب قوم حتی اپنی زبان کے وجود کو بھی ایرانیوں کا مرہون منت سمجھتی ہے کیونکہ یہ ایرانی قوم تھی جس نے عربی صرف ونحو کو ایک خاص طریقے سے سمجھا او درحقیقت اس کا احیا کیا۔ حدیث پیغمبرؐ کی جمع آوری، قرآن کریم کی تفسیر اور آیات قرآنی کی تعبیر گذاری جو براہ راست اسلام کی حیات سے تعلق رکھتی تھی، ایرانیوں کی مرہون منت ہے جو اس مملکت میں اسلام کے نفوذ کے ابتدائی برسوں سے ہی شروع ہوچکی تھی او رجس کا سلسلہ ہمارے عہد تک پھیلا ہوا ہے۔

بنی عباس کے عہد میں ایرانیوں کا اثر ونفوذ، ان وجوہ کی بناپر جنہیں تاریخ میں تلاش کیا جانا چاہئے، بہت بڑھ گیا اور اتنا بڑھا کہ درحقیقت حکومت اسلامی پوری طرح ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئی اور برامکہ اور خاندان سہل کے ایرانی وزراء اور دیگر لوگوں کے ہاتھ میں درحقیقت حکومت اسلامی کی نبض تھی اور ساسانیوں کے رسوم وآداب دوبارہ زندہ ہوگئے۔ سرکاری دفاتر میں بھی عہد کہن کی رسومات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور حکومت اسلامی کے اداروں اور دفتروں کی تشکیل بھی ساسانی عہد کی طرح کی گئی۔ عہد عباسی کی کتب تواریخ وسیر، حکومت بنی عباس میں ایرانی منشیوں اور وزرا کی کیفیت وطریقۂ کار سے بھری پڑی ہیں۔ اس

میں شک نہیں کہ ایک قوم کا دوسری قوم پر سیاسی اور اقتصادی اثر ورسوخ دوسرے تمام شعبوں پر بھی اثر انداز ہوا کرتا ہے۔ ایرانیوں نے چونکہ سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے کافی اثر ورسوخ بڑھالیا تھا اس لئے ان کے علمی اور ادبی آثار بھی اس وقت کے تمام اسلامی ممالک میں پھیل اور اسلامی تہذیب وتمدن میں کچھ ایسا گھل مل گئے کہ آج بھی انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جن لوگوں نے زمانۂ قدیم سے ہی اسلام میں ایرانی تمدن کی تاثیر میں زبردست مدد کی وہ شعوبیہ تھے۔ واضح رہے کہ اس گروہ نے عربوں سے شدید مخالفت کی وجہ سے عہد ساسانی کے ایران کے بہت گرانقدر آثار کا عربی میں ترجمہ کیا، تاکہ غیر متمدن عربوں کے سامنے تمدن کی میزان پیش کرسکیں۔

شعوبیوں نے بہت سی ایرانی کتابوں کا پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ان میں ادب، امثال وحکم، تاریخی کارنامے، قصص وحکایات اور کبھی نجوم ومنطق، حساب وہندسہ کی کتابیں ملتی ہیں جن میں بہت سی کتابوں کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں کیا ہے جن کا یہاں ذکر طوالت کلام کا باعث ہوگا۔ لیکن اس نکتے پر توجہ رہنی چاہئے کہ ان کتابوں کے ترجموں نے اسلامی علوم کی پیشرفت میں بہت اہم کردار ادا کیا اور نئے نئے علوم کی بنیاد بنے نیز بعد میں بڑے بڑے علماء اور اساتذہ کے وجود میں آنے کا سبب ہوئے جن میں ابونصر فارابی، ابوعلی سینا اور ابوریحان بیرونی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کی عالمی شہرت کا سلسلہ اسی زمانے سے شروع ہوا اور اسی زمانے سے عالمی شہرت حاصل کی۔

لیکن اسلامی تمدن پر روم ویونان کے اثرات بھی نہایت حیرت انگیز رہے کیونکہ اسکندریہ میں نوافلاطونیوں نے اپنے افکار وعقائد کی تعلیم دینا شروع کردی تھی کہ اسلام نے انہیں فتح کرلیا اور بعد میں جیسا کہ کتب ملل ونحل میں ملتا ہے وہ آراء وعقائد معتزلہ، صوفیوں اور خاص کر اخوان الصفا کے حکما کے ذریعے پورے اسلامی ممالک میں پھیل گئے اور سریانی،

بین النہرین اور نصیبین میں فلسفۂ یونان وروم کی تبلیغ میں مشغول تھے کہ اسلام وہاں جا پہنچا اور اس قوم کے علم ومعرفت کے عظیم خزانوں سے فائدہ اٹھایا۔

تین علمی مراکز:

یہاں صدر اسلام کے ان تین علمی مراکز کا مختصراً تذکرہ ناگزیر ہے جنہوں نے درحقیقت اسلام میں مغرب ومشرق کے علوم وفلسفہ کے نفوذ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور جو علم وفلسفۂ اسلامی کے وجود میں آنے کا اصلی سبب بنے۔ یہ تین اہم مراکز تین شہروں جندی شاپور، حران اور اسکندریہ میں واقع تھے۔

۱۔ جندی شاپور:

یہ شہر مورخین ومحققین کے بقول خوزستان میں واقع تھا اور یہ وہی شہر ہے جسے عربوں نے الاھواز کہا ہے جو موجودہ زمانے میں شہر دزفول اور شوشتر کے درمیان واقع ہے اور اب بھی اس کے خرابات دریائے کارون کے قریب شاہ آباد کے نام سے موجود ہیں۔ اسے ساسانی بادشاہ شاپور اول (۲۴۱ تا ۲۷۲ عیسوی) نے رومی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد قائم کیا اور رومی قیدیوں کو وہاں رکھا۔[۱۹] انوشیرواں نے وہاں ایک اسپتال تعمیر کروایا جہاں اطبا مریضوں کے علاج معالجے میں مشغول رہتے تھے۔ اس نے وہاں ایک طبیہ کالج بھی قائم کیا جو اس زمانے میں بہت مشہور تھا اور وہاں طالب علموں کو یونانی اور آرامی زبانوں میں اس فن یا علم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے خوزستان کو فتح کرتے ہی اس شہر کو بھی فتح کرلیا۔ بیمۂ عہد عباسی تک جندی شاپور اور اس کا کالج واسپتال بھرا پڑا تھا لیکن ساتویں صدی ہجری میں یعنی اس وقت جب مشہور مسلمان جغرافیا داں یاقوت حموی حیات تھا، یہ شہر ویران ہوچکا تھا اور یہاں جز خرابات کچھ اور باقی نہیں بچا تھا۔[۲۰] قفطی کے بقول اس شہر کو قسطنطنیہ کی طرح آباد کیا گیا تھا اور جن لوگوں نے اس شہر کے پہلے طبی کالج میں تعلیم دی وہ رومی علما تھے (جن کے بارے میں مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ شاہ بیزانس ژوستین کے عہد میں

فرار کر کے ایران آ گئے تھے) لیکن جب ایک مدت گذر گئی تو علاقے بلکہ دیگر جگہوں کے ایرانیوں نے بھی مذکورہ طبی کالج میں تعلیم حاصل کی اور پھر رومی اساتذہ کی جگہ تدریس کا کام کیا۔ یہ علم روز افزوں بہت مقبول ومشہور ہونے لگا اور اساتذہ واطبانے مزید قواعد وقوانین بنائے اور علاج معالج کے نت نئے طریقے سے آشنا ہوئے۔ انوشیرواں کی حکومت کے آٹھویں سال اس طبی کالج کے حکیموں نے کسری کے حکم سے علم طب میں مناظرہ کیا اور اس کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی۔ ۲۱ جندی شاپور کے اطباء کا خیال تھا کہ صرف وہ اس علم کے حق دار ہیں اور یہ علم ان کے درمیان سے باہر نہیں جائے گا۔اور دوسروں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں ۲۲

جندی شاپور اس زمانے میں علم طب کی تعلیم کا مرکز تھا اور اس علم کو حاصل کرنے کے لئے علماء وفضلاء اور نوآموز اس کالج میں آتے تھے منجملہ عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ ثقفی نے ، جو حضرت رسولؐ کے زمانے میں تھا، اس کالج میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک عرصہ تک فارس میں علاج معالجہ کے کاموں میں مشغول رہا۔ ۲۳ اس کالج میں یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طب کی تعلیم دی جاتی تھی اور بہت سے بڑے ہندوستانی اطباء پہلوی زبان میں اس علم کی تعلیم دیتے تھے۔

یہ کالج جیسا کہ عرض کیا گیا ، عہد اسلام میں ختم نہیں ہوا بلکہ اس عہد کے خلفاء اور اونچے طبقے کے لوگوں کو اطبا کی ضرورت کے پیش نظر بدستور باقی رہا جیسے ایرانیوں کے عہد میں تھا۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عباسیوں کے زمانے میں اس میں ترقی ہوئی اور غالبًا خلفا جب بیمار ہوتے تو اسی کالج کے اطباء سے رجوع کرتے تھے منجملہ خلیفۂ دوم عباسی ابوجعفر منصور بغداد کو آباد کرنے کے زمانے میں پیٹ کے شدید درد میں مبتلا ہوا اور اس کے اطباء دوبار اس کے معالجے میں ناکام رہے تو اسے جندی شاپور کے کالج اور دار الطب کے سرپرست وسربراہ جرجیس بن بختیشوع کے پاس لے گئے اور اس نے منصور کا علاج کیا ۲۴ مشہور عباسی خلیفہ

ہارون الرشید نے جبرئیل بن بختیشوع کو جندی شاپور کے طبی کالج کا پرنسپل بنایا اور اسے حکم دیا کہ وہ بغداد میں جندی شاپور جیسا کالج بنائے۔۲۵

ساسانیوں کے عہد میں یہ کالج اور اسپتال بہت مشہور تھا اور بڑے بڑے اطبا نے وہاں تربیت حاصل کی تھی جن میں سے زیادہ تر مسلمان اور غیر مسلم اقوام سے متعلق تھے۔

عہد اسلام میں جس پہلے شخص نے اسپتال بنوایا اس کا نام ولید بن عبد الملک تھا اس نے جو اسپتال بنوایا تھا اس میں اطبا کو جمع کیا اور ان کے لئے آراضی وغیرہ مقرر کیا اور حکم دیا تھا جذام کے مریضوں کو اسپتال کے ایک حصے میں علاحدہ رکھا جائے تاکہ عام مریضوں سے ان کی آمیزش نہ ہوسکے۔ دوسرے حصے میں نابیناوں کو رکھا جائے۔ ان کے لئے بھی جذام کے مریضوں کی طرح اراضی وغیرہ مقرر کی گئی تھی۔۲۶

۲۔حرّان:

صدر اسلام کا دوسرا علمی مرکز شہر حران تھا۔ یہ وہ شہر ہے جو جعفر فیا دانوں کے خیال میں جزیرہ کے قریب واقع تھا اور آج ادسا اور راس العین کے درمیان واقع ہے۔ یہ بہت پرانا شہر ہے اور یونان وروم، عیسائیت واسلام کی تاریخ کا ایک دور اس نے دیکھا ہے۔ یہ اسکندر مقدونی کے عہد میں آباد تھا اور کئی خداؤں کے مرکز کے نام سے مشہور تھا۔

عیسائیوں کے عہد میں شہر حران مختلف اقوام وملل کا مرکز تھا اور اس کے اصلی باشندے سریانی تھے لیکن بہت سے مقدونی، یونانی، رومی، ارمنی اور عرب بھی وہاں ساکن تھے اور جب عیسائیت نے غلبہ پایا تو اس عہد کی پوری مغربی دنیا اور رومی سلطنت وقلمرو میں نفوذ حاصل کرلیا۔ رومیوں نے حران کے لوگوں کو بھی عیسائی بنانا چاہا لیکن انہیں کامیابی نہیں ملی اسی لئے کلیسا والے حران کو بت پرستوں کا شہر یا (Helenopolis)۲۷ کہتے تھے اور آہستہ آہستہ یہ شہر حقیقت میں بت پرستوں کا ملجا وماوی بن گیا۔ جو شخص بھی عیسائی بننا نہیں چاہتا۔ چاہے وہ جس قوم وقبیلہ کا ہو، اس شہر کی جانب رخ کرتا تھا۔ لہذا کافی تعداد میں رومی، یونانی، ارمنی اور عرب

وغیرہ اس شہر میں جمع ہوگئے اور بظاہر ان کا مذہب بابلی، یونانی اور نوفلاطونی وغیرہ ادیان کا امتزاج تھا۔ یہ مذہب اسلام کی نشر واشاعت اور عہد مامون تک اس شہر میں عام تھا۔ اس عہد میں انہیں صائبین کہا گیا۔ قرآن کریم میں اس مذہب کا کئی جگہ نام آیا ہے۔[۲۸]

صائبین وہ لوگ تھے جو ظہور اسلام کے وقت ایک خالص مذہب کے ماننے والے تھے۔ انہیں کبھی مغتسلہ کہا گیا تو کبھی پیروان یحیٰی۔ یہ خدا فرشتوں اور قیامت پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کے مخصوص رسوم وآداب تھے جن کا ذکر ملل ونحل کی کتابوں میں ملتا ہے۔[۲۹]

ابن ندیم نے حران والوں کے صائبین کہلانے کی وجہ تفصیل سے بیان کی ہے۔[۳۰]

بہر حال حران والوں نے فلسفۂ یونان وروم سے آشنائی اور مغربی علوم وادبیات پر مکمل عبور رکھنے کی وجہ سے اسلام کے علمی ارتقا میں زبردست کردار ادا کیا اور روم کے مفتوحہ علاقوں میں اس دین کی نشر واشاعت کے آغاز سے ہی مسلمانوں کے ساتھ گھل مل گئے اور چونکہ وہ ذمی تھے اس لئے جذیہ ادا کرکے عربوں کی گزند سے محفوظ نیز مسلمانوں کے ساتھ بیشتر گھل مل جانے میں بھی کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنے شہر میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں مختلف قدیم علوم اور فلسفۂ روم ویونان کی مختلف اقسام کی تعلیم دی جاتی تھی اور جس مدرسہ نے بھی معاشرے کو بڑے بڑے علما دیے۔ ان مدارس میں نجوم وریاضیات کی تعلیم دی جاتی تھی اور فلسفۂ افلاطون پر بھی غور وفکر کی جاتی تھی۔

اس مرکز کے جن علما نے اپنا علم خلفائے اسلام کے اختیار میں دیدیا تھا ان میں ایک ثابت بن قرہ حرانی (۲۲۱-۲۸۸ھ) تھا جو ریاضیات اور نجوم کا استاد تھا۔ دوسرا حکیم ابن ستان اور اس کا بیٹا ابراہیم بن ستان تھا جو علم طب وظواہر میں ماہر تھے۔ ان کے علاوہ ہلال بن ابراہیم طبیب اور اس کا بیٹا ابو اسحاق صابی ریاضی، ہندسہ وعلم ہیئت میں اور بتانی، رصد کواکب اور علم ہندسہ میں بہت مہارت رکھتے تھے۔[۳۱]

یونانی علوم جندی شاپور اور حران کے مدارس کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچے۔ طب

یونانی نے جندی شاپور کالج اور اسکے علماء کے وسیلے سے اسلامی مملکت میں نفوذ پیدا کیا اور اس نے بڑے بڑے علماء دنیائے انسانیت کو دیئے۔ علوم ریاضی ہندسہ، نجوم، فلسفہ اور فلکیات بھی حران کے مدارس کے ذریعے دنیائے اسلام میں پہنچے اور علمائے اسلام نے ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان میں زبردست مہارت بہم پہنچائی اور ان علوم کی مختلف اقسام یا شعبوں میں ایسے ایسے علماء اور فلسفی پیدا ہوئے جو یقیناً عصر اسلامی کے مفاخر میں شمار کئے جاتے ہیں۔

۳۔ اسکندریہ:

صدر اسلام میں تیسرا علمی مرکز شہر اسکندریہ تھا جو علوم اسلامی کی بنیاد ڈالنے میں دونوں مراکز کی طرح بہت فعال ومؤثر تھا۔ یہ شہر جیسا کہ تاریخ فلسفہ کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔ دوسری صدی عیسوی سے نو افلاطونیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

فلوطین (Plotin) ان کے مذہب وفلسفہ کا بانی تھا متعدد صدیوں کے دوران اس کے شاگردوں کی بدولت ان کے مذہب وفلسفہ نے ترقی کی۔ نو افلاطونیوں کا مذہب، حکمت اشراق وعرفان سے مشابہ چیز ہے جو فلسفیانہ اور علمی دلائل وبراہین سے آمیختہ ہے ۳۲ اور چونکہ اس مذہب کے ماننے والے اکثر عیسائی تھے لہٰذا اس مکتب کے فلسفہ کے ساتھ عیسائیت کے عقائد ونظریات بھی شامل ہوگئے اور ان کے عقائد وآرا نسطوریوں کی تعلیمات اور مدارس کے ذریعے جو عیسائیت کی ایک شاخ تھی، پورے مشرق قریب وسطی میں پھیل گئے۔ ۶۴۲ء میں جس سال عربوں نے اسکندریہ کو فتح کیا تھا نو افلاطونیوں کے افکار پوری طرح اس شہر کے مدارس اور مشرق قریب کے ممالک پر مسلط تھے۔ نسطوری چونکہ یونانی اور سریانی زبانوں پر عبور رکھتے تھے لہذا نو افلاطونیوں کی کتابوں کی نقل وترجموں میں بہت موثر واقع ہوئے۔ مثال کے طور پر ظہور اسلام کے وقت رومیوں کی پوری مشرقی قلمرو میں ان کے افکار ونظریات کا رواج تھا اور یہ نسطوری عیسائی تھے جو یونانی، سریانی اور عربی زبانوں سے واقفیت کی بنا پر اسلام کی علمی تحریک کے اولین مترجمین بن گئے۔

مدرسہ اسکندریہ، عربوں کے مصر پہنچنے کے وقت طب، کیمیا اور علوم طبیعیات کے لئے مشہور تھا نیز طلسمات کے سیکھنے اور سحر وجادو سے نجات پانے کے علاوہ نجوم میں بھی کافی شہرت رکھتا تھا۔ مسلمانوں نے عہد اموی سے اس مدرسہ کے علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور بہت سی متداول علمی کتب کا اس مدرسہ میں عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس مدرسہ کے بہت سے اطباء نے اس عہد کے خلفاء کا علاج معالجہ کیا لیکن عباسیوں نے مرکز خلافت سے اسکندریہ کی دوری اور اس شہر کے مدارس کے علماء کا ان کے عہد میں طلسمات وعزائم ونجات اور اس قسم کے دوسرے خرافات میں پڑنا، عرب فوجیوں کی آمد کے وقت شہر کے عظیم کتب خانوں کا تباہ وبرباد ہونا سپاہیان اسلام کی آمد سے قبل شہر کے علماء ومشاہیر کا فرار ہونا اور اسکندریہ کے نسطوری علماء کے صوفیانہ طرز عمل کے پیش نظر اس شہر کے مدارس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن یونانی، سریانی اور رومی کتب کے عربی ترجمے اور اسکندریہ کے نسطوری علماء کے ذریعہ ارسطو، افلاطون اور جالینوس کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے اعتبار سے عباسیوں کے عہد میں بہت کام ہوا۔

ان تین شہروں پر اسلام کا قبضہ ہونے سے ان کے مدارس میں زمانۂ قدیم سے جو علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے وہ بھی اسلام کی دسترس میں آگئے اور ان مراکز میں متداول علوم سے فائدہ اٹھایا۔

مدرسہ جندی شاپور کے ایرانیوں اور ہندیوں نے، حران کے مدرسہ کے رومیوں اور سریانیوں نے نیز اسکندریہ کے نسطوریوں اور یعقوبیوں نے مروجہ علوم کی تعلیم اور انہیں عربی زبان میں منتقل کرکے ماضی کے علماء کے آثار کے تحفظ اور ان علوم کی حفاظت میں، جو انسان کے کئی ہزار سالہ فکر ودانش کے بعد میسر ہوئے تھے، عظیم خدمات انجام دیں اور درواقع یہی علما اسلامی مملکت میں عظیم ترین طبیب، فلسفی، عالم، مفکر، ریاضی داں، منجم اور مہندس کے وجود میں آنے کا باعث بنے جن میں ایک شیخ الرئیس ابو علی سینا بھی ہیں۔

عربی میں فلسفہ وعلوم کی کتابوں کے تراجم:

علوم وفلسفہ کی کتابوں کے عربی تراجم کا آغاز درحقیقت عباسیوں کے عہد سے ہوا۔ عہد اموی میں جو تراجم ہوئے تھے وہ بہت کم تھے اتنے کہ اسلامی محققین نے ان کے ذکر کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہد اموی میں ان تراجم کو مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ عباسیوں کے اس کام میں بہت زیادہ دلچسپی لینے اور سرپرستی کرنے کی چند وجوہ ہیں۔

۱۔ در واقع عہد اموی تاریخ عرب و اسلام کے لحاظ سے دور جاہلیت کا باقی ماندہ دور تھا اور عربوں نے چونکہ بہت سے ملکوں پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن اپنے جاہلانہ اصولوں پر ہی قائم تھے اور عہد جاہلیت کی بے خبری کے گرداب میں ہاتھ پیر مار رہے تھے اور کبھی بھی انہیں اس بات کی فکر نہیں ہوئی کہ عربستان سے باہر فلسفہ وعلوم ودانش کی حیرت انگیز طور پر فراوانی پائی جاتی ہے جن کا حصول، حیات سرمدی مل جانے کے مترادف تھا۔

۲۔ اموی خلفا جو خود جاہل عربوں میں سے تھے، اپنی نسلی برتری پر اعتقاد رکھتے تھے اور لہو ولعب میں مشغول رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی دوسری اقوام وملل پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوسری اقوام ان سے بہتر تمدن اور دانش کی حامل ہیں۔ لہٰذا انہوں نے دیگر اقوام کے آثار پر توجہ نہیں دی اور غالباً خود کو چند عربی قصیدوں میں ہی سرگرم رکھتے تھے جو فلاں بدوی عرب شاعر نے کہے تھے۔

۳۔ عہد اموی کے اوائل کا زمانہ تقریباً خلفائے راشدین کے زمانے کی طرح ممالک کی فتح اور لشکر کشی میں گزرا اور اسلام نے ابھی تک وسیع وعریض سلطنت میں اپنا نفوذ پیدا نہیں کیا تھا اور وہ دینی تحریک جس کا لازمہ اطلاع اور مختلف علوم وفنون سے آگاہی ہے، وجود میں نہیں آئی تھی۔ اسلام کے تسلط اور مفتوحہ ممالک میں مسلمانوں کی ترقی نیز وسیع اسلامی سلطنتوں کے باشندوں کا اس نئے دین کو قبول کرنے کے ساتھ دینی تحریک شروع ہوئی اور مسلمان۔ قضا وقدر، حدوث وقدم عالم اور جبر و اختیار اور ان جیسے دیگر مسائل سے دو چار

ہوئے جن کا جواب علوم وفلسفہ سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

۴۔ مسلم ہے کہ دوسری صدی ہجری کے مسلمان، پہلی صدی خاص کر صدر اسلام اور اوائل عہد اموی سے بیشتر معتقد تھے اور ان مسلمانوں نے عیسائی، یہودی، زرتشتی، صابی وغیرہ مذاہب کے ماننے والوں سے اختلاط وآمیزش پیدا کی۔ مذکورہ مذاہب کے لوگ مسلمانوں سے مناظرے میں اس وقت کے متداول علوم اور متمدن ممالک کے فلسفہ سے باخبر تھے اور انھوں نے اپنے مذہبی مناظروں میں منطق ارسطو، فلسفہ افلاطون، مکتب نو افلاطونیان اور ایرانی علما کے اخلاقیات سے فائدہ اٹھایا، مسلمان بھی جو ان تمام باتوں سے بے خبر تھے اپنے مقدس دین کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے ان علوم سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوئے۔

۵۔ عباسیوں کے عہد میں اسلام کرۂ ارض کے ایک حصے پر، جو چین سے اندلس تک پھیلا ہوا تھا، مسلط تھا اور اس عظیم خطے کے تمام لوگ سیاسی اور اقتصادی وجوہ کی بنا پر عربی زبان سے واقف ہو چکے تھے اور اسی وحدت زبان اور ایک دوسرے سے اتحاد واختلاط نے ایک دوسرے کے حالات سے باخبر کیا اور یہ صورتحال اموی عہد میں موجود نہیں تھی۔

۶۔ خلفائے عباسی کا طب وفلسفہ ومنطق وریاضی ونجوم وغیرہ سے زبردست دلچسپی لینا بھی عربی میں مختلف کتابوں کے تراجم کا باعث بنا کیونکہ عباسی خاص کر منصور، رشید اور مامون نے علوم کے مذکورہ شعبوں پر خاص توجہ دی تھی اور غالباً علمائے فن سے یہ علوم سیکھتے تھے اور ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چونکہ وہ کسی اور زبان سے واقف نہیں تھے اس لئے ان کتابوں کے تراجم سے استفادہ کرنے پر مجبور تھے۔

۷۔ عباسیوں کے عہد کی عظیم اسلامی سلطنت کی اقتصادیات ایک ہو چکی تھی جو نتیجے کی صورت میں ایک سیاسی پالیسی اختیار کرنے کی متقاضی تھی اور جہاں تک یہ واحد اقتصادیات مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں دیکھی جا سکتی تھی، اس میں مجبوراً علم وثقافت کو بھی

شامل کرلیا گیا۔ بنابرایں عباسیوں کے عہد میں چونکہ مصری، مراکشی، ایرانی، رومی اور سریانی وغیرہ ایک اقتصاد کے تحت زندگی بسر کررہے تھے اس لئے ثقافت کے اعتبار سے بھی متحد ہونے پر مجبور تھے اور ثقافتی اتحاد کا واحد راستہ کسی ایک زبان میں ان اقوام کے متمدن آثار کا ترجمہ تھا چنانچہ عربوں کے تسلط کی وجہ سے عربی کا انتخاب کیا گیا۔

۸۔ امویوں کو اسلام کی زبردست طاقت اور صدر اسلام کے مسلمانوں کے جنگجویانہ اور بہادرانہ جذبات نیز اسلام و مسلمین کی زبردست طاقت کے پیش نظر زیر دست اقوام کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بنی امیہ اسلام کی آئیڈیالوجی کے حامل ومحافظ تھے جو اس زمانے میں ان وجوہات کی بنا پر جن کا مشاہدہ اس وقت کی اقتصادی اور سیاسی تاریخ میں کیا جاسکتا ہے، بہت طاقتور ہوچکے تھے اسی وجہ سے عرب کے مسلمان دیگر اقوام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے لیکن بعد کی صدیوں میں جب مسلمانوں کی زبردست طاقت میں رخنہ پیدا ہوا اور اب عرب سپاہ صرف جہاد فی سبیل اللہ کے اصول پر اطراف کے ممالک پر حملہ آور نہیں ہوسکتے تھے نیز اندرونی مخالفین بھی ان نئے مہمانوں کی سرکوبی کے لئے لیس ہوچکے تھے، خلفا اور اسلامی حکمراں مجبور ہوگئے کہ اندرونی دشمنوں کی قوت کو خود کو محفوظ کرنے کے لئے استعمال کریں۔ مملکت کے اندر اسلام کے مخالفین جیسا کہ عرض کیا گیا، اپنے عہد کے رائج علوم مثلاً فلسفہ ومنطق کے حامل تھے اور علوم کی طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرتے تھے لہذا مسلمانوں کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں کا دفاع کرنے کیلئے خود دشمنوں کی طاقت کو ان کے خلاف استعمال کریں۔ اس لئے وہ اس زمانے کے علوم وفلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے تاکہ اسی حربے سے دشمنان اسلام و مسلمین کو ممالک اسلامیہ کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کردیں۔

اسلام پر حملہ براہ راست حکمراں جماعتوں پر حملہ تھا اور مسلمانوں کی شکست کا مطلب حکمراں جماعت کی کمزوری کا آغاز تھا۔ اس لئے عباسیوں نے جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، مخالفین کو کچلنے کے لئے شمشیر کا سہارا لینے کے ساتھ مخالفت

کی بنیاد کا قلع قمع کرنے کے لئے ان اسلحوں سے خود کو لیس کرنا ضروری سمجھا جن سے ان کے دشمن لیس تھے۔ شعوبیوں زندیقوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صابئیوں نیز اسلامی فرقے اسماعیلی، قرامطہ، شیعہ اور خلافت کے دیگر مخالفین علم ومعرفت سے لیس تھے، وہ بھی اجباری طور پر ان اسلحوں سے لیس ہوئے تاکہ اپنے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ کرسکیں۔ اور خود کو نابودی سے بچائیں۔

لہٰذا مذکورہ بالا اسباب وعلل کی وجہ سے عربوں کے مفتوحہ ممالک کے علوم و اوران کی ثقافت اسلام میں داخل ہوگئی اور اس ثقافت کے نفوذ کی بقا کا واحد ذریعہ عربی زبان میں مختلف اقوام و ملل کے علمی، ادبی فلسفیانہ اور منطقی متون کا ترجمہ تھا۔ ان متون کا جس قوم نے پہلی بار ترجمہ کرنا شروع کیا وہ ایرانی تھے۔ اس کی تفصیل اسلام کی سیاسی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ پہلی قوم جس نے عربوں کی نسلی برتری کی منطق کو قبول کرنے سے انکار کردیا، وہ ایرانی تھی۔ ایرانی وہ اولین لوگ تھے جنہوں نے اس بچکانہ منطق کی مخالفت کی اور جو راستہ اختیار کیا اس کا مقصد عربوں اور دیگر مسلم اقوام کے سامنے اپنی تہذیب وتمدن کا مظاہرہ کرنا تھا اور اپنی عظیم تہذیب وثقافت کی نشان دہی کا واحد طریقہ فارسی متون کا عربی زبان میں ترجمہ تھا۔ لہٰذا کچھ ایرانیوں نے جو عربی اور فارسی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے فارسی کتابوں کے عربی ترجمے کی راہ میں بے پایاں کوششیں کیں۔

صاحب الفہرست ابن ندیم نے اپنی کتاب کا ایک باب ایرانی مترجمین سے مخصوص کیا ہے اور بے شمار ایرانی مترجمین کے نام گنوائے ہیں جن میں صف اول کے پندرہ ایرانی مترجمین کے نام یہ ہیں۔

ا۔ ابن مقفع ۲۔ خاندان نوبخت ۳۔ موسیٰ و یوسف۔ ابن خالد، جو داود بن عبد اللہ بن حمید بن قحطبہ کے ملازمین میں تھے اور جو فارسی کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کرتے تھے۔ ۴۔ ابالحسن علی بن زید تمیمی، جس نے زیج شہریار کا ترجمہ کیا۔ ۵۔ حسن بن سہل ۶۔ بلاذری

۷۔ جبلۃ بن سالم دبیر ہشام ۸۔ اسحٰق بن یزید جو اختیار نامہ کا مترجم ہے۔ ۹۔ محمد بن جہم برمکی۔ ۱۰۔ ہشام بن قاسم ۱۱۔ موسیٰ بن عیسیٰ الکردی ۱۲۔ زادویہ شاہویہ اصفہانی۔ ۱۳۔ محمد بن ابراہیم بن مطیار اصفہانی۔ ۱۴۔ بہرام ابن مردان شاہ موبد شہر یار ۱۵۔ عمر بن فرخان۔

مذکورہ مترجمین نے بیشتر علمی، ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ متون اور دیگر علوم کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا مثلاً ابن مقفع نے 'خدائی نامک' کو پہلوی سے عربی میں منتقل کیا اور اسے ''تاریخ پادشاہان ایران'' کا نام دیا اور بظاہر محمد جریر طبری نے عہد ساسانیان کے وقائع کے ذکر میں اس کتاب سے بہت کام لیا ہے۔ ابن مقفع نے اس کے علاوہ کتاب آئین نامہ کا ترجمہ کیا جو قدیم ایرانیوں کے آداب و رسوم اور طور طریقوں کے ذکر میں ہے۔ مسعودی نے اس کتاب کا ذکر اہمیت کے ساتھ کیا ہے وہ کہتا ہے یہ ایک بہت بڑی اور ضخیم کتاب ہے جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابن مقفع نے کلیلہ ودمنہ، شرح احوال مزدک، کتاب درحالات انو شیرواں اور کتاب ادب الکبیر وادب الصغیر کے بھی عربی میں ترجمے کیے ۴۴؎

ایرانی مترجمین نے ادبی اور تاریخی متون کے تراجم کے علاوہ بہت سے علمی، فلسفی اور دینی متون کے بھی عربی میں ترجمے کیے منجملہ ابن مقفع نے ارسطو کی کتاب منطق کی تین فصلیں۔ قاطیغوریاس ۴۵؎ باری ارمینیاس ۴۶؎ اور انا طولیقا ۴۷؎ کا سلیس اور آسان ترجمہ کیا۔

ابن الندیم، حمزہ بن حسن اصفہانی، مسعودی اور دیگر ایرانی محققین نے اپنی کتابوں میں ایسے بہت سے ایرانیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے علمی اور فلسفیانہ متون کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ان تمام مترجمین کا ذکر یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ ۴۸؎

علمی متون کے عربی تراجم کا سلسلہ تقریباً منصور عباسی کی خلافت کے زمانے سے شروع ہوا اور اسی زمانے سے ہی مترجمین نے ہندی، سریانی یونانی، مصری اور رومی زبانوں کے متون عربی میں منتقل کرنا شروع کیے اور انہوں نے فلسفہ و منطق ارسطو، آراء افلاطون ونو افلاطون، فلسفۂ ہندیان، فلکیات یونانیان اور طب رومیان وایرانیان کو عربی میں منتقل کر

ڈالا۔ مامون کے عہد تک متون کے تراجم کا عمل ذرا سستی اور کندروی سے انجام پاتا رہا اور صرف منطق و مجسطی اور چند طبی کتب نیز فلسفہ ارسطو وافلاطون کے چند مباحث کے سوا غالباً کسی اور چیز کا عربی میں ترجمہ نہیں ہوسکا تھا لیکن مامون کے عہد میں ہی ایران، حران، ہندوستان، اسکندریہ وغیرہ کے علمانے علمی، فلسفی، ادبی اور تاریخی متون کے ترجمے کیے۔

مامون (عباسی خلیفہ) ایک عالم اور دانشور شخص تھا اور علما ودانشوروں کی بہت زیادہ قدردانی کیا کرتا تھا۔ جعفر بن محمد انماطی جو اپنے وقت کا ایک عالم اور دربار خلافت سے متعلق تھا، کہتا ہے کہ ''جب مامون بغداد آیا اور تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے دار الخلافہ میں ایک ایسا ہال بنوایا جہاں فقہا اور متکلمین جمع ہوتے تھے اور وہ خود بھی موجود رہتا تھا اور ان کے بحث ومباحثہ اور مناظرہ کو غور سے سنا کرتا تھا۔ اس نے اس زمانے کے سو فقہا کو بلایا اور ان میں دس کا اپنی مصاحبت ومجالست کے لئے انتخاب کیا جن میں ایک احمد بن ابی داود اور دوسرے بشر المریسی اور تیسرے میں خود یعنی جعفر بن محمد انماطی تھے۔ ایک دن ہمیں کھانا کھلایا گیا۔ دسترخوان پر تقریباً تین سو اقسام کے کھانے تھے اور مامون نے طبی نقطہ نظر سے ہر ایک کے خواص بیان کیے اور کہا فلاں غذا رطوبت کے لئے، دوسری صفرا دور کرنے کے لئے تیسری سودا کو روکنے اور چوتھی اور پانچویں غذا فلاں فلاں مرض میں مفید ہے۔ ۹ے''

عہد مامون کے مورخین نے مامون کی علم دوستی اور اپنے زمانے کے علوم سے متعلق معلومات کے سلسلے میں حکایات درج کی ہیں جن کا ذکر ایک علاحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔ یہاں اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا کہ وہ ادب، تفسیر، حدیث، طب فلسفہ اور اپنے زمانے کے دیگر علوم سے واقف تھا اور ہر ایک سے آگاہ تھا اور بعض مورخین نے اقلیدس ہفتم کے حل کو اس سے منسوب کیا ہے۔

مامون عباسی نے اپنے بیٹے کو ہارون الرشید کے دربار میں بھیجا جو خلافت کے جاہ و حشم کے اعتبار سے پوری اسلامی تاریخ میں بے نظیر تھا۔ یہ دربار عیش وعشرت کے انواع و

اقسام کے وسائل سے مملو ہونے کیساتھ ساسانیوں کے عہد سے بھی بڑھ گیا تھا، چونکہ علماء ودانشوروں کی روزی روٹی کا واحد وسیلہ تھا لہذا ہر عالم اور دانشور خود کو اس سے قریب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مامون رشید دربار کے زبردست عالموں سے علوم وفنون کی تعلیم میں مشغول ہوگیا اور ان سے علوم حاصل کئے نیز اپنی عمر کا ایک حصہ ایران میں گذارا اور فضل بن سہل ملقب بہ ذوالریاستین جیسے ماہر اور ذی علم وزیر سے جو ایرانی اور ایک زبردست عالم تھا، کسب فیض کیا۔ اسی فضل اور اس کے خاندان نے مامون الرشید کو کتب کے ترجموں کی جانب متوجہ کیا نتیجتاً تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اور بغداد پہونچتے ہی اس نے عالم اسلام اور دیگر غیر اسلامی ممالک کے علماء دانشوروں، فلسفیوں، فضلاء، شعرا اور مصنفین کو اپنے یہاں بلایا اور "بیت الحکمت" میں علمی، ادبی فلسفی اور طبی متون کے تراجم کرائے۔

بغداد کا بیت الحکمت یا مامون کا مخصوص کتب خانہ، عالم اسلام کے عظیم ترین کتب خانوں میں ایک تھا۔ افسوس کہ اس کتابخانے کے سلسلے میں جسے کتابوں میں خزینۃ الکتب اور بیت الحکمت کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے، ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ اس مرکز علم ودانش کے بارے میں مفصل معلومات دستیاب نہیں ہوئیں۔

حواشی:

۱۔تفسیر طبری جلد چہارم ص ۲۵

۲۔اغانی جلد ۱۴ ص ۱۵۰

۳۔شرح نہج البلاغہ طبع مصر جلد اول ص ۱۸

۴۔ زہر الادب حاشیہ عقد الفرید جلد اول ص ۲۲

۵۔کتاب المعارف ابن قتیبہ ص ۲۹

۶۔اغانی جلد ۹ ص ۸۸

۷۔کتاب المعارف ص ۲۹

۸۔ زہر الآداب حاشیہ عقد الفرید جلد اول ص ۲۲

۹۔عقد الفرید جلد ۳ ص ۲۹۶

۱۰۔ مذکورہ کتب خانے کے بارے میں تفصیلات کے لئے ملاحظہ کریں: کتب خانۂ اسکندریہ از مولانا شبلی نعمانی

۱۱۔ سبک شناسی جلد اول ص ۱۵۹

۱۲۔ اغانی جلد ۱۶ ص ۸۸

۱۳۔عصر المامون جلد اول ص ۸۴

۱۴۔ ابن خلکان جلد دوم ص ۴۰۸

۱۵۔ان دانشوروں سے آگاہی کے لئے ملاحظہ کریں: ابن خلکان، اعلام الموقعین وطبقات ابن سعد

۱۶۔زیاد اعجم کے حالات میں مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: اغانی جلد ۱۴ ص ۹۹

۱۷۔ ملاحظہ کریں: عیون الاخبار والشعرا والشعریٰ ابن قتیبہ: اغانی ومعجم الادبا اور اخبار وسیر کی دیگر کتب

۱۸۔ دائرۃ المعارف اسلامی ذیل کلمہ، جندی شاپور،

۱۹۔معجم البلدان یاقوت ذیل کلمہ' جندی شاپور،

۲۰۔ اخبار الحکما ص ۱۳۳

۲۱۔ المصدر نفسہ ص ۴ ۱۷

۲۲۔ اخبار الحکما ص ۱۶۱

۲۳۔ اخبار الحکما ص ۱۵۸

۲۴۔ اخبار الحکما ص ۳۸۳

۲۵۔خطط مقریزی جلد چہارم ص ۲۵۸

۲۶۔ دائرۃ المعارف اسلامی ذیل کلمہ' حران'

۲۷۔ ملاحظہ کریں: قرآن کریم سورہ بقرہ آیۂ ۵۹: سورہ مائدہ آیہ ۴۳ و سورۂ حج آیہ ۱۷

۲۸۔ ملل ونحل شہرستانی حاشیہ الفصل جلد دوم ص ۷۶ تا ۷۹ : مسعودی جلد اول ص ۳۷۸ وقفطی ص ۳۱۱

۲۹۔ الفہرست: ابن الندیم ص ۳۲۰

۳۰۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: تاریخ الحکماء از قفطی وشہرزوری وقاضی صاعد اندلسی وطبقات الاطبا ابن اصیبعہ اور علما واطبا وفلاسفہ اسلام کے دیگر تذکرے۔

۳۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیے۔

(I) Britanica Encyclopedia Ammonius Saccas & Plotin

(ii) History of Westrn Phylosophy By Bertrand Russel p. 308

۳۲۔ الفہرست ابن الندیم ص ۳۴۲

۳۳۔ المصدر نفسہ ص ۱۱۸

۳۴۔ Catgory

۳۵۔ Berierimeneias

۳۶۔ analitic

۳۷۔ دیکھئے: الفہرست ابن الندیم ؛ سنی ملوک الارض حمزہ بن حسن اصفہانی اور مروج الذہب مسعودی

۳۸۔ عصر المامون جلد اول ص ۳۶۰

۳۹۔ تجارب السلف ص ۱۵۷

☆ یہ مقالہ ابن سینا پر فارسی زبان میں لکھی گئی ڈاکٹر صادق کیہرین کی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب، لکچرار شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی نے کیا ہے۔

☆☆☆